بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دُنیا کا کام ہمیشہ دو قسم کے آدمیوں سے چلتا ہے۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں، اور ان کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہیں کیا ہونا چاہیے، اور اس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر انکے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اس وقت تنقید کی جائیگی تو یہ خرابیاں پیدا ہونگی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگ جائیگی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انکی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُنکے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہو گا خوب ہی ہو رہا ہو گا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کو موجود ہونگی، ہر وقت ان مصلحتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہینگے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکینگے کہ کونسا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جنکی نظر "کیا ہونا چاہیے" پر ہوتی ہے، وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتے

ہیں، اسلیے وہ اسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہلِ حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ انہیں اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے شیدائی اسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کرینگے، تاکہ ان خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اسکا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یک لخت بند ہو جائے، اور اس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (آئیڈیل) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اول اول تو اسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور نسیہ سے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گذرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اسکے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جنکی نشاندھی تنقید میں کی گئی ہے، اور اگر عام لوگوں کی روح بھی حقیقت میں اسی معیار کو حق تسلیم کرتی ہے جسے مدنظر رکھ کر ناقد نے حال پر تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی حالت اور اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت

(لیڈرشپ) خود بخود نشوونما پاکر سامنے آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف واقع نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جسکی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر "اہلِ حال" حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو قوم کے حق میں سم قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اُسکے لحاظ سے حاضر پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگاکر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے طفرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ جس حالت کو مثال قرار دیتا ہو اُس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم ازکم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے فاروقی طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروقِ اعظم سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی علی مرتضیٰ اور ابو عبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمٰن ابن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزلِ مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابۂ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اسکے بعین مخالف سمت میں جارہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال میں وہی ذریعہ تلاش کرونگا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اُٹھا سکے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملیگا تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند کرونگا۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے

ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستہ سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاتر العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جنکی عملی زندگی میں اور جنکے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جنکا حال یہ ہے کہ چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں، جنکو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اُسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد اگر کوئی چیز انکی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزلِ مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لیگا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بنکر چھوٹ سکتا ہے، مگر اس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے ــــ جسکو وہ خود آئیڈیل کہتا ہو ــــ گھبرائے، اسکا نام سُن کر چیں بجبیں ہو جائے، اسکو پامال ہوتے دیکھ کر آفرین و مرحبا کے نعرے بلند کرے، اسکی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا یہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم ابھی تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے

عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اسکے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جائے تو اسکی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام لے دیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اسکی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اسکے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری وجسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اسکی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہوں میں کوئی مبغوض نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہوتا ـــــ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اسکے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اسکے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے، اور اپنی ناموں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں اسلام اور اسکی کلچر کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین علانیہ توڑے جاتے ہیں، اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اسلیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اسکو حلال کریں۔ وہاں 'مسلمان' عورت اسی طرح تبرّج جاہلیت کے ساتھ شمعِ انجمن بنی نظر آتی ہے جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی میم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ ناخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لیکر پیروؤں تک شاذونادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں، نشست وبرخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی کلچر کا کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آتا، اور ایک معمولی مسلمان ان حامیانِ اسلام اور محافظینِ تہذیبِ اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے

مباحث آپ گھنٹوں سُنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہ آئیگا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اسکے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائیگا، بلکہ اگر قرآن و سنت کا نقطۂ نظر صریح طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اسکے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائیگا۔ ان کی کمیٹیوں اور ان کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سُنینگے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اسکو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان کا زعیم اکبر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے رمضان کے زمانہ میں پنڈت نہرو کے ساتھ لنچ کھاتا ہے اور روائسریگل لاج سے سگرٹ پیتا ہوا نکلتا ہے۔ انکی ورکنگ کمیٹی کا ایک ذمہ دار رکن علانیہ کہتا ہے کہ جنگ میں انگریزوں کی مدد نہ کرنا خدا سے غداری ہے۔ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملیگا کہ سمت قبلہ کدھر ہے، اور اسباب عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ پوری ورکنگ کمیٹی کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شائد کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکینگے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ اسلامی کلچر جسے کانگریس اور اسکی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، یہی ہے؟ اور یہی اسکے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے، ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومت الٰہیہ تک پہنچا جائیگا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ —— یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے

اسلام اور اسکی کلچر کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں ہو کہ ابھی ہم کلچر کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں کلچر کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دورنگی اور گندم نمائی وجو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی و سیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں آپ واقعی مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے اگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو کھینچے جائیے تو دیکھنے والا یہی خیال کریگا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رعب اُٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و خرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں لہذا جو مرکز بھی سامنے آئے اسکے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مل کر چلو، انشاءاللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے"، اسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر"، اور "تنظیم محض بغرض تنظیم"، اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آخر ان کا مطمح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اسکی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورت تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اِس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں، اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چڑھائی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں چل سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ ہی آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہینگے کہ ماشاء اللہ ہمارا "انجن" اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گذر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کرینگے؟ جو اس سے علانیہ برسر بغاوت ہیں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر ہی کا درد ان کے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، انکی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں جب واقعی اسلامی جذبہ مشتعل ہوا تھا تو آپ نے یہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ آج وہ چیز ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی

جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطمح نظر ہے، تو بلا شبہ آپکو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں، مگر کم از کم آپ کو یہ تو دیکھنا پڑیگا کہ ان میں قوم پرستانہ ایثار، جرأت و بسالت، اور تدبر و حکمت بھی ہے یا نہیں۔ یہ صفات آپ کو اپنے اِن لیڈروں میں کہاں نظر آتی ہیں؟ سروں اور خان بہادروں اور نوابوں کے اس مجمع میں کون ایسا ہے جس نے اپنی قوم کے لیے کبھی اپنا بال بھی بیکا ہونے دیا؟ ان میں کون جنگ کا مرد میدان ہے؟ کس کو آپ اُس قوم کے لیڈروں کی ٹکر کا سمجھتے ہیں جس سے آپ مسابقت کرنے جا رہے ہیں؟ اِن کے تدبر کا دیوالیہ پن تو اسی سے ظاہر ہے کہ تین سال سے لڑ رہے ہیں اور آج تک یہ طے نہ کر سکے کہ ہمیں چاہنا کیا چاہیے۔ کمیٹیوں پر کمیٹیاں بیٹھتی ہیں اور مطلوب کا تعین کیے بغیر اٹھ جاتی ہیں۔ گویا لڑائی تو جاری ہے مگر یہ ابھی تصفیہ طلب ہے کہ وہ چیز کیا ہو جس کے لیے ہم لڑیں! پھر سیاسی جنگ کے فن سے نا آشنائی کا حال یہ ہے کہ تین سال کی مدت میں کوئی ایک کارگر حربہ بھی انہیں نہ مل سکا۔ جب ملتے ہیں اوچھے ہتھیار ہی ملتے ہیں، جیسے یوم نجات، یا رائل کمیشن، یا وفد لندن! کیا یہ تیسرے درجہ کی قیادت آپ کو کانگریس کے مقابلہ میں فتح و ظفر سے ہم آغوش کرا سکتی ہے؟

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم باہر سے تنقید کرنے کے بجائے اندر جا کر اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ یہ اعتراض بظاہر بڑا معقول معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ معترضین کے سامنے

معاملہ کے تمام پہلو نہیں ہیں۔ میرے سب سے الگ رہنے کی اولین وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی جتنی مختلف جماعتیں اس وقت مختلف راستوں میں دوڑ دھوپ کر رہی ہیں، مجھے ان سب کے مسلک میں بنیادی نقائص نظر آتے ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر تنقید صحیح کے ذریعہ سے ان جماعتوں کے ذی فہم لوگوں میں ان نقائص کا احساس پیدا کر دیا جائے تو یہ سب ایک جماعتی نصب العین پر مجتمع ہو سکتے ہیں۔ اسی غرض سے میں نے کامل غیر جانبداری اختیار کر کے ہر ایک پر آزادانہ تنقید کی ہے۔ اگر میں کسی ایک جماعت کا آدمی بنکر دوسروں پر تنقید کروں تو وہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو شخص ایمانداری کے ساتھ کسی جماعت میں اصولی خرابیاں پاتا ہو اس کے لیے جماعتی نظام کے اندر داخل ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کا ضمیر کس طرح ایسے کُل کا جز بننا قبول کر سکتا ہے جس کو وہ بحیثیت مجموعی غلط سمجھتا ہو؟ تیسری وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اپنے ہم خیال بہت کم نظر آتے ہوں اس کے لیے باہر سے تنقید کرنا زیادہ مفید ہے، کیونکہ اس طرح وہ اپنے خیالات کی تبلیغ وسیع پیمانہ پر کر سکے گا۔ جماعتی نظام کا پابند ہو جانے کے بعد اسے باہر اپنی زبان بند کرنی پڑے گی، اور اندر انقلاب پیدا کرنا بہت دیر طلب کام ہوگا۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ اندر سے اصلاح کرنا صرف اس جماعت میں ممکن ہے جو بالکل جمہوری اصولوں پر بنی ہو۔ لیکن جس جماعت کا دستور اس ہوشیاری کے ساتھ بنایا گیا ہو کہ ظاہر میں تو جمہوریت کی نمائش ہو اور باطن میں قدم قدم پر ارباب اقتدار نے اپنی پوزیشن کی حفاظت کے لیے مورچے بنا رکھے ہوں، اُس کا صحیح علاج باہر ہی سے ہو سکتا ہے۔ اندر جا کر لڑنا اپنی قوتوں کو ضائع کرنا ہے۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے

اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ "جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسی" کو سب مل کر مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس سب لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعہ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (المائدہ)	ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ

دیتے ہیں، اور جو خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبہ-۲)	زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

احادیث میں التزام جماعت، اور اطاعت امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور من شذ شذ فی النار اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی

ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور اُن اماموں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصول پر دنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیے مگر ان ہدایات کو دنیوی جتھہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر اپنی معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبعی کے مطابق اپنا جتھہ بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانب دار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا نہ دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟